

کونو

مجموعہ کلام

ضیاء جبل پوری

زیر اہتمام گونج "پبلیکیشنز" - نظام آباد

طاعت: دائرہ الیکٹرک پریس حیدرآباد
 کتابت: محمد عبدالاحد قادری
 بایئٹنگ: حفیظ بایئٹنگ ورس - حیدرآباد

طائپنگ: آر بی پریس - نظام آباد

سنہ اشاعت دسمبر ۱۹۹۴ء

قیمت: ۲۵ روپے

891.4291

ملنے کے پتے:

۱۔ مصنف: مکان نمبر 104-2-1 ترمذیہ مسجد

قدیم کتبستان کا مارٹری

۲۔ دفتر گونج - اعظم روڈ نظام آباد

یہ کتاب اردو اکیڈمی آف انڈیا کے زیر اہتمام سے شائع ہوئی

مودبانہ التماس
ان عظیم ہستیوں کے نام

مولانا جلال الدین رومیؒ

علامہ اقبالؒ

ڈاک ہمارکس شوٹڈ

لیو - تھانٹ

رابندر ناتھ ٹیگور

مدرٹریا

اور

جی کارٹر

صنیہ جیل پوری

یونیورسٹی آف حیدرآباد

● میں آپ سے واقف نہیں۔ اس سے پہلے آپ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ خیال تھا کہ اس غیر معروف شاعر کا کلام یوں ہی ہوگا۔ لیکن کتاب کے اندر دیکھا تو خوشگوار حیرت ہوئی۔ توقع نہ تھی۔ اتنی اچھی غزلیں ہیں۔ صفحہ ۲۴، ۲۷، ۳۱ اور ۳۳ کی غزلیں دیکھئے۔ واہ۔ واہ میں کبھی نامستحق داد نہیں دیتا۔ آپ کے اشعار واقعی پسند آئے اس لئے محبوب ہو گیا ہوں اور سکوتِ سخن شناس اختیار نہیں کر سکتا۔

گیان چند جین

یونیورسٹی آف حیدرآباد

- ۲۴۔ نامساعد وقت تھا موسم کی مجبوری بھی تھی
 ۳۴۔ غم کی مدت نہ بڑھا چاند پچھل جائے گا
 ۳۵۔ ہر دن دہی پرانی دُعا اور کچھ کہو
 ۳۶۔ شاخ گل بار پر شراب اُگے

لندن
۱۸ اگست ۱۹۹۴ء

● ”ضیاء جیل پوری کے کوئی بیس سال (۱۹۷۳ - ۱۹۹۳ء) کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب میری نظر سے گزرا۔ وہ ایک خوش گوشتاغر ہیں۔ وہ جویات اور جس طرح کہنا چاہتے ہیں کہہ لیتے ہیں۔ ان کی زبان صاف ستھری اور ان کا کلام اسقام سے پاک ہے۔ ان کے یہاں غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کا چہرہ چلے۔ اس کا وجہ سے ان کے کلام میں سماجی خرابیوں کا تذکرہ ہے۔ اُس میں طنز زیادہ ہے اور مزاح کم۔ اس لئے اس میں تلخی ہے۔ اگر وہ زیادہ ہمت سے کام لیں تو اس انتخاب کو نوشتا بہ بنادیں۔

ضیاء جیل پوری کا کلام اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ وہ اتنی ہی بات کرتے ہیں جتنی ضرورت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا اور کیوں کہہ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا کلام قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور وہ کو ایسے شاعروں کی ضرورت ہے۔“

محمد ضیاء الدین شکیب

Dr. M. Z. A. Shakeeb,
26 Croft House Third Avenue
LONDON W10 4SN.

● آج جب کہ بیشتر جدید شعراء اپنی کلاسیکی روایات اور قدیم ادبی ورثہ سے ناابلہ ہیں اور ان کی غزلوں میں زبان و بیان اور عروض کی بے شمار غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ایسے دور میں ضیاء جیل پوری کے کلام میں کلاسیکی رجحان اور نئی نچتگی کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ضیاء کی غزلوں کی بعض ردیفیں میر اور سودا کے لہجے کی یاد تازہ کرتی ہیں مثلاً طئے اور آوے ہے جیسی ردیفوں میں بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں اور اس طرح اس کلاسیکی لب و لہجے کو نئی معنویت اور تازگی عطا کی ہے۔ ان ردیفوں میں دو شعر دیکھئے

بھبھکی بھبھکی رات جب ناگن سی بل کھا چکے ہے
 مجھ سے سمجھ کو جلا دے کہ بنایا مجھوں = میری ٹیسی کو ضیاء شیشہ گری آوے ہے
 ضیاء کے کلاسیکی لب و لہجے سے یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ انھیں بدلتی ہوئی ادبی قدروں کا احساس نہیں ہے۔ دراصل ضیاء پرانی محروایات اور اقدار کی توسیع و تجدید کے علمبردار ہیں۔ پرانی قدروں کو وہ نئی معنویت عطا کرنا چاہتے ہیں چنانچہ خود کہتے ہیں

خشتک ہونٹوں پہ تبسم تو سجا رکھا ہے
 گرد آنکھوں کے جو حلقے ہیں انھیں کیا کہئے

روایتوں کے سمندر گھنٹا لٹے چیلے
 حلقوں جو سیپ میں موتی نکالتے چیلے

جہو اکا تیز جھونگا کہہ گیا ہے
تھارے پاس اب گیارہ گیا ہے

صدف سے نئے لور آیا روتی نکالنا ضیاء کو خوب آتا ہے اور یہی انداز اُن کے
فن کی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے موجودہ سیاسی نظام میں انسانی
اقدار کو جس طرح پاہل کیا جا رہا ہے۔ اور آزاد معاشرے کے احساس دور یا شعور شہرِ بولی
اور قلم کاروں کے احساسات دور جذبات کو جس طرح مجروح کیا جا رہا ہے۔ اس کا
احساس ضیاء کو بھی ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حال کی عکاسی ضیاء نے اپنی غزلیوں میں
بہت موثر انداز سے کی ہے۔

ظلمتیں جب چھا گئیں ابرِ قلم پر اے ضیاء = ظلم کی تعریف میں رطل اللسان ہو پڑا
اُس نے جو کچھ کیا جمہوریت کے نا ابر = یادِ شاہروں نے کبھی ایسا ستم ڈھیا نہ تھا
الغلابی بن رہے ہیں دشمنانِ انقلاب = ایسا دھوکا تو زمانے نے کبھی کھایا نہ تھا
امن اور انسانیت کے نام سے ڈرتے ہیں لوگ

یہ تاثر تو کبھی الفاظ نے پایا نہ تھا

جیپ چرائی ہے میرے گاؤں میں = آگے نزدیک شاید انتخاب
مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضیاء جیل پوری ایک سچے شاعر ہیں ایک سچے شاعر
کامل جانا ستمِ غیر مترقبہ سے کم نہیں —

احشامِ آخر
کوٹہ (راجستھان)

شکاگو ایریا
۳۱ ستمبر ۱۹۹۵ء

سیدھا شتم علی

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی
پرنسپل سکریٹری حکومت آندھرا پردیش

● جناب محمد ضیاء الدین، ضیاء جبل پوری کا یہ دوسرا مجموعہ کلام ”کوہِ نوس“ جو ”بیاضِ نسک“ کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ اردو شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہو گا۔ ہندوستان میں اردو زبان میں دور سے گزر رہی ہے۔ اس میں تقیل اور مشکل الفاظ کی بجائے سادگی کی ضرورت ہے اور یہ بات ضیاء کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پر بھی ان کی نظر ہے اور ایسے اشعار پڑھنے والے پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے

بن باس تو دنیا کو دکھانے کے لئے ہے = تیاریاں راون کو مٹانے کے لئے ہیں
ہوے ہیں چار ہی دن اس کو منتخب ہو کر = وہ شخص پہلے کبھی بھوٹ بولتا تو نہ تھا
وہ جماعت کم تھی کیا ایسی کسی سے انتقام = زخم کھا کر دستِ قاتل کو دعا دیتی گئی
آپ نے جو کچھ کیا جمہوریت کے نام پر = بادشاہوں نے کبھی ایسا شتم ڈھایا نہ تھا
ضیاء صاحب نے چند غزلیں بھی تھیں۔ ان میں سے کئی شعر مجھے پسند آئے اور ان میں سے چند یہ ہیں۔

دنیا لینہ قوم کو مذہب سے کیا غرض = دیر و حرم کو ضرورت نہیں رہی
شدتِ لشتہ لہی آپ ہے اپنی معراج = لوگ پیاسوں کو بھی میخوار سمجھ لیتے ہیں
مشورہ تیرا بجا ہے مگر اے جراتِ شوق = اس زمانے میں تو پہنستے ہوئے جی ڈرتا ہے

یہ موج ہو، نکہت گل، نغمہ لبیل = عنوان یہ سارے ترے آنے کیلئے ہیں
 بندوں کے واسطے بڑا نازک مقام ہے = سنتے ہیں سو رہا ہے خدا جاگتے رہو
 گردشِ دواراں نے سمجھا ہے مجھے میں نے اسے = میں جدھر بڑھ گیا، وہ راستہ دیتی گئی
 عشقِ جاہنچاں سرا ز دار تک = حسنِ چھلکا تھا سرا ز بام سے
 تیری نیت کو سمجھتا ہے بڑا دانا ہے = اس کو سجدوں سے نہ بہلا کہ خدا ہے وہ بھی
 تڑپ تڑپ کچھ مرا ہے وہ روشنی کے لئے = سیاہ رات میں جو آفتاب جیسا تھا
 سرِ نظر ترا جہرہ سرِ قدم تری یاد = نفسِ نفس تری آواز پانگے ہے مجھے
 درت و بازو اگر نہیں بچتے = سرکٹانے کا حوصلہ بھی دے
 میری دعا ہے کہ ضیاءِ جبلِ پوری اردو کے جدید شاعروں میں ایک
 اونچا مقام حاصل کریں۔

ہاشم علی اختر

پیش لفظ

ضیاء جبل پوری ہمارے ادبی حلقوں میں ایک خاصہ شناسا نام ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ دور اب یہ دوسرا مجموعہ کلام آپ کے پیش نظر ہے۔ وہ ایک عرصہ دراز سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اور اپنے مخصوص طرز فکر اور انداز بیان سے اپنی ایک انفرادی شناخت بنا رہے ہیں۔ ویسے ضیاء و جبل پوری نے کئی بہت اچھی نظمیں تخلیق کی ہیں لیکن ان کا فطری رجحان غزل کی طرف معلوم ہوتا ہے یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں ہر میتی شاعر اپنی شعر گوئی کا آغاز غزل ہی سے کرتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غزل ہماری شاعری کی ایسی صنف ہے جو اسلامی سے قابو میں نہیں آتی۔ غزل کا فن ایک رچے ہوئے شعری مزاج، ایک تربیت یافتہ ذوق، گہرے مطالعے، اور فنی ریاضت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک نظم گو شاعر کے مقابلے میں ایک غزل گو شاعر کے لئے اپنی شعری روایات و مسلمات سے کما حقہ واقف ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ اپنی شعری روایات سے محض داخلی سہی آگہی کے ساتھ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک کامیاب نظم کہہ لے لیکن ایک کامیاب غزل کہنا ممکن نہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ غزل کی صنف میں بھی تجربے ہوئے میں اور تبدیلیاں آئی ہیں اور بہت اچھی تبدیلیاں آئی ہیں لیکن غزل کا رشتہ اپنی روایات سے ٹوٹا نہیں۔ ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ ”آزاد غزل“ کے تجربے کی عدم مقبولیت اور

ناکامی اس کا ثبوت ہے۔ غزل کا مزاج اس طرح کی تبدیلیوں اور تجربوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک اچھی غزل کہنے کے لئے آداب غزل کا پاس دلچسپ بھی ضروری ہے اور عصری حالات و مسائل سے آگاہی بھی۔ فکرو احساس کی آماج بھی چاہیئے اور اظہار کا سلیقہ بھی۔

ضیاء چیلوری کی غزلیں پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس نکتے سے واقف ہیں۔ انہوں نے اس صنف میں کوئی تجربے تو نہیں کئے لیکن اس کو بڑی سلامت روی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں بلند آہنگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر جہاں جذبے کی شدت حاوی ہے

ضیاء جیل پوری کے یہاں ہم کو خود آگاہی بھی ملتی ہے اور حیات و کائنات کا درگ بھی۔ دور جدید کی مادہ پرستی نے ہمارے معاشرے میں جس بے حسی اور بے ہمتی کو برپا کر دیا ہے اس کا عکس بھی ہم کو ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں عصر حاضر کا کرب، گھٹن اور ناامودگی کا اثر اس نمایاں ہے۔ لیکن جہت اچھی بات یہ ہے کہ شاعر بالواسطہ کا شکار نہیں ہے۔ وہ ایک پر وقار حوصلہ رکھتا ہے۔ اور اس کی یہی رجحانیت ایک زار کے صبر آزما سفر میں خلستان بھی تلاش کر لیتی ہے اور شاعر کا ذوق جمال جاگتا ہے۔ ضیاء جیل پوری زندگی کی محض ایک جہت کے قیدی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو پر ان کی نظر ہے۔

ضیاء جیل پوری کے یہاں لغظوں کو برتنے کا سلیقہ ہے۔ ان کے لہجے اور طرز اظہار میں بڑی سنجیدگی اور خود اعتمادی ہے اور میں ان کی اس خود اعتمادی ہی کو ان کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔ یہ چیز ان کے بیشتر اشعار میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے اور یہی چیز ان کے شعری سفر میں ان کی انفرادیت کو متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

میں آخر میں ضیاء جمیل یوپی کی غزلوں سے ایک مختصر سا انتخاب پیش کرتا ہوں۔ تاکہ اُن کی شاعری کے بارے میں میرے ان تاثرات کی تصدیق ہو سکے۔

دھوپ دی ہے تو سائباں بھی دے = جوہیں بے گھراہنیں مکاں بھی دے

پھول عریاں بھی ہے ملبوس میں تو رہی ہے = اس سلیقے سے کسے جامعہ درسی آدے ہے

ان کے دامن میں سلامت تو نہ فرزانہ سمجھ = چند دیوانوں کو بھی بخیمہ گری آدے ہے

انقلابات نے ظالم کو بنایا مصطف = اور مظلوم کو دُروں کی سزائیں دی ہیں

ہمارے طرف کی وسعت کی پاس عہد و ف = فریب کھائے ہوئے ہیں فریب کھانا ہے

آرام گیا، نیند گئی، صبر و سکون بھی = کیا ہم پہ کوئی قہر خدا ٹوٹ رہا ہے؟

ہمکے ہوں پھول جیسے کہیں لا شعور میں = پوئی آ رہی ہے آج کسی گلبدن کی یاد

آگ پانی میں لگا کر دیکھیں = اُس کو آئینہ دکھا کر دیکھیں

میں نے سیرابی کی لذت پالی ہے = اے ندی تجھ کو بتا کیسا لگا

میخو اردوں سے نسبت ٹھہری میخانے میخانے ٹھہرے = تشنہ لبوں کو دیکھ کے چھلکے میخانے میخانے ٹھہرے

رخ سے نقاب رخ کو اٹھا کر سامنے آؤ تو ہم جاہلین = اڑتی ہوئی شہرت تو سنی ہے افسانے افسانے ٹھہرے

لکھ بکھرا سہی ہر حال میں سچ کہتا ہے = کیوں نہ ٹوٹے ہوئے آئینے میں چہرہ دیکھوں

ڈاکٹر مقبول فاروقی

شعبہ اردو، آندھرا یونیورسٹی

والٹیر

۱۹ ستمبر ۱۹۹۴ء

● **حیدر آباد کے شاعری افق پر ۱۹۷۰ء** کے بعد جو شاعر نمایاں ہوئے ہیں ان میں سے ایک نام ضیاء جمیل پوری کا ہے۔ ضیاء صاحب نے مختلف رسالوں میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔ ویسے تو وہ مراد آباد کے رہنے والے ہیں لیکن بعض حالات کی وجہ سے وہ حیدر آباد منتقل ہو گئے اور ان کا شاعری سفر بھی دکن میں شروع ہوا۔ ہندوپاک کے جبرائڈ میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

یوں تو حیدر آباد فرخندہ بنیاد کا ہر ضلع ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے جیسے محبوب نگر، کرمینگر، وزنگل اور نظام آباد کے شعراء نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ فن کے تجزیہ پر کسی کی میراث نہیں ہے یہ تو ذہانت و شاعری صلاحیت اور زاویہ نگاہ کا فرق ہے۔ آپ اگر ضیاء جمیل پوری کا کلام دیکھیں تو یہ محسوس نہیں ہو گا کہ وہ ادبی مرکز سے دور ہیں وہ نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں وہ فارمولہ شاعری کے قائل نہیں بلکہ جدیدیت اور ترقی پسندی کا لبیل بھی اپنے اوپر لگانا نہیں چاہتے کیونکہ لبیل لگا کر کوئی اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔ اسکے بغیر بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے جیسے۔۔ اختر الامان اور ترقی پسندوں میں مخدوم و منیع وغیرہ ہیں یہی حال ضیاء جمیل پوری کا ہے۔ ان کے یہاں مضامین اپنی ندرت کی بدولت کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ حاکم وقت نے مجمع میں سرائیں دی ہیں = ہم نے ہر حال میں خلقت کو دعائیں دی ہیں انقلاب نے ظالم کو بتایا مضاف = اور مظلوم کو دروں کی سرائیں دی ہیں آج کل غزل کی دنیا میں عصری حیثیت کم نظر آ رہی ہے۔ عصری حیثیت اور مسائل کو سلجھ ہوئے انداز میں پیش کرنے کا مہلقہ مخدوم نے جتایا ہے۔ کیونکہ مخدوم کے یہاں کوئی نثر بازی قسم کی شاعری نہیں ملتی لیکن ادبی اور جمہ کی ترقی پسند شاعری کے نمونے اور

شہکار محذوم اور فیض کے یہاں مل جائیں گے یہی اثر نو جوانوں نے بھی قبول کیا اور ضیاء
جبل پوری کے یہاں دیکھے ہجیر اور میر کے انداز میں کئی شعر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے
ہیں جیسے ے

میرزا انوں سے نسبت پھر میٹھا میٹھا لڑے = تشنہ لبوں کو دیکھ کے چھلکے، سیانے سیانے لڑے
یہ دیکھو ان کی محفل میں فرزانوں پر کیا گزری ہے = دیوانوں کی بات نہ پوچھو، دیوانے دیوانے لڑے
یہ دیکھو ہجیر ضیاء کی خاصیت معلوم ہوتا ہے ان کے یہاں بات کہنے کا اک نرالا
ڈھنگ ہے جو تغزل کو بھی قائم رکھتا ہے اور مضمون کے نئے سین کو بھی برقرار رکھتا ہے ان کے
یہاں خود اعتمادی بدرجہ اتم موجود ہے ے

اس میں تحریب کا بیغام نہ پرمشیدہ ہو = فاختہ لیکے کوئی شاخ ہری آوے ہے
صوبی عرباں بھی ہے لبوس میں تور بھی ہے = اس سلیقہ سے کسے جامہ درمی آوے ہے
ایک انداز تکلم دیکھئے جو مکالماتی انداز ہے۔ اس خود کلامی میں قاری کو اپنائیت
کا احساس ہوتا ہے۔ اور شاعر کو اپنی محرومی کا ے

ہجر کی کتنی کڑی لمبی سزا تھی تم نہ تھے = وات بھر جس نے مجھے بھیڑا ہوا تھی تم نہ تھے
میں ضیاء علیس بچھا کر گوش برآواز کتا = صرف مستقبل کے قدموں کی صدا تھی تم نہ تھے
نمانے کی ستم ظریفی اور اس عہد کی بے مروتی پر ضیاء کے جذبات ملاحظہ کیجئے ے

ہم سے ملنے زمانہ جو رقیبانہ ملے = ہم زمانے سے ملے ہیں تو بشریف نہ ملے
دیکھئے پھر دستِ قاتل سے پکڑے ہو = سو چئے تاریخ کیوں اپنے کو دوا ہر اجڑے

ضیاء جبل پوری قطری شاعر ہیں ان کے یہاں آمد ہے آمد و نہیں۔ روایتی
انداز سے ضیاء کو بچنا چاہیے کیوں کہ زندگی کے متعلق ان کا مطالعہ بڑا گہرا ہے غزل کے
میدان میں ان کے جوہر زیادہ نکھرتے ہیں ے

اپنی ملکوں پر کوئی خواب سجاے رکھئے = اپنے خاکوں میں کوئی تاج بنائے رکھئے
 عین ممکن ہے بہارِ دل کا گمراہ ہو جائے = خانہٴ دل کے در و بام سجاے رکھئے
 ایک خوبصورت مضمون ملاحظہ کیجئے۔

حد و دِشام میں سورج نے خود کشی کر لی = گھٹن کے کرب سے بہروں پر دھوپ پڑی ہے
 ضیاء کے قتل سے درشتِ شفقت میں ہر خی = جو ذات لوٹ کے بکھری حیات نکھری ہے
 بعض وقت ضیاء صاحبِ خوبصورت انداز سے عمیق بات کہہ جاتے ہیں دیکھئے
 میں تو معمولی خیال لکھتا ہوں لیکن اگر غور کیا جائے تو ایک جہانِ معنی و رنگ و بو کھل جاتا ہے
 نکلی ہے آج قوسِ قزح آئن بان سے = یا آسمان کو انی تیرے یا نیکن کی یاد
 رات کی رانی بھی تکیں نہ دیتی ہوگی = زخمِ یادوں کا سرِ شام ہلکتا ہوگا
 ضیاء جیل پوری کا پہلا مجموعہ کلام ”بیا میں شکر“ شائع ہو کر ادبی دنیا سے داد
 تحسین حاصل کر چکا ہے اب دوسرا مجموعہ کلام شائع ہو رہا ہے۔ ان کے دوسرے مجموعہ کلام
 پر مبارکباد دیتے ہوئے اس پیشِ لفظ کو ختم کرتا ہوں۔

امیر عارفی
 شعبہ اردو - دہلی یونیورسٹی

دہلی

حکیموں کی حکایتیں

ضیاء حیل پوری جن کا پورا نام محمد ضیاء الدین ہے یکم دسمبر ۱۹۳۲ء کو حضرت جگر مراد آبادی کے وطن مراد آباد (یو. پی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناب محمد ناصر الدین مشہور حکیم تھے۔ ضیاء صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انٹر کے بعد محکمہ ریلوے سے وابستہ ہو گئے اور گزشتہ ۲۵ برسوں سے نظام آباد ضلع میں مقیم ہیں اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں شریک ہیں۔ دو برس قبل آپ بحیثیت اسٹیشن ماسٹر کاماریڈمی و ذیلیفہ حسن خدمت میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے کاماریڈمی در ضلع نظام آباد ضیاء حیل پوری صاحب کا وطن ثانی ہو گیا۔

ضیاء صاحب کو بچپن ہی سے اپنے اطراف شری ماحول ملا۔ آپ اس ماحول سے بچ نہ سکے اور طالب علمی کے دور ہی سے شعر کہنے لگے۔ آپ کی تخلیقات ملک اور بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں مسلسل چھپتی رہتی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ آپ کے کلام کا انتخاب ”بیاض فکر“ کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا اور اس مختصر سے تعداد میں مجموعہ کو اردو والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

عناز شاعر ڈاکٹر محبوب راہی نے ضیاء صاحب کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”ضیاء صاحب نے جدیدیت کو فیشن اور فارمولے کے طور پر نہیں اپنایا ہے۔ تقلید یوں کی طرح موضوعات اور علامات کی جگہ گائی سے پرہیز کرتے ہوئے وہ جدید تقاضوں کو سمجھنے کا شعور رکھتے ہیں۔ زندگی کے پیش آئند مسائل کی کچھ گہرائی

تغیرات

میں اترتے ہیں۔ عصری حسیت سے واقف ہیں لہٰذا درشب پر ان کی نگاہ ہے۔ اٹکا سماجی شعور
 بیدار ہے وہ جدید تقاضوں کو سمجھنے اور پرکھنے کیلئے بصیرت اور بصارت دونوں۔
 جسے بہرہ مند نہیں۔ — ضیا و صاحب مبہم علامات، مہمل اشاریت، بعید از
 قیاس و واقعات ناقابلِ فہم اور دُور از کار و پیچیدہ طرزِ بیان عجیب و غریب نامانوس اور
 بے سہلک الفاظ اور جناتی زبان کو جوڑ توڑ کر اپنی شاعری پر نام نہاد جدیدیت کا لمبیل
 رنگانے کی بجائے صالِح روایات کی زرخیز مٹی پر جدید اشعار کے رنگا رنگ گل پوٹے
 کھلاتے ہیں۔ الفاظ و معانی تک ان کی رسائی ہے۔“

ڈاکٹر محبوب راہی صاحب کے ان خیالات سے مکمل طور پر اتفاق کرتے ہوئے
 ضیا و صاحب کے تعلق سے میں اپنی طرف سے بس اتنا ہی کہوں گا کہ ضیا و صاحب ابتداء
 ہی سے میرے پسندیدہ شاعر رہے ہیں مجھے ہمیشہ ان سے مل کر اور ان کا کلام سن کر
 خوشی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

یہ بات میرے لئے باعثِ افتخار ہے کہ کوہِ نور کی اشاعت گونج پبلیکیشنز
 کے زیرِ اہتمام عمل میں آرہی ہے۔

جمیل نظم آبادی
 مدیر گونج نظم آباد

۳۳ ستمبر ۱۹۹۴ء

مُنَاجَات

دشت میں پھول اب کھلا ہی دے
 دل کو اک زخمِ گلِ نہا ہی دے
 ان رقیبوں کو شاہِ راہِ وفا
 از رہِ مصلحت بتا ہی دے
 جس نایاب ہے کہاں ڈھونڈوں
 کوئی محبوبِ بے وفا ہی دے
 مگر مناسب نہیں ہے سیم و زر
 علم و محنت کی کیمیا ہی دے
 کوئی منتظر مجھے دکھا لیکن
 قلب کو میرے خوش نگاہی دے
 نالہ نیم شب اگر ہے گراں
 اک سبک آہِ صبح گاہی دے
 دست و بازو اگر نہیں بختے
 سرگٹانے کا حوصلہ ہی دے
 زندگی بن گئی شبِ ہجیراں
 دل کے داغوں کو کچھ ضیاء ہی دے

نعت شریف

اپنی راہوں میں ترا نقشِ قدم رکھا ہے
میں نے نظروں میں سدا باغِ ارم رکھا ہے

ہم گنہ گاروں کو نسبت ہے ترے نام کے ساتھ
تو نے ہر حال میں امت کا بھرم رکھا ہے

تیرے تسلیم و ہدایت، تیری رحمت، تیرا فیض
سائے عالم کے لئے تیرا کرم رکھا ہے

سجدہ شوق سلامت ہے، تو دل پہ نکھیں کھول
ہاں! مدینہ میں بھی اک بابِ حرم رکھا ہے

باہشتا ہوں کے وہاں تاج بھی جھک جاتے ہیں
جس جگہ تیرے غلاموں نے قدم رکھا ہے

میرے مالک تری توحید کے قربانِ ضیاء
کعبہٴ دل میں مرے ایک صنم رکھا ہے

رَحْمَةُ الْعَالَمِينَ

غلغلہ سا اٹھا
زلزلہ آگیا
اور لبوں پہ فرشتوں کے
تبسم حق تیز تر ہو گئی

وہ نشہ جوتے
صور بھلے ہوئے
مستعد ہو گیا
بند توبہ کا دروازہ ہونے لگا
چاند سورج ڈرے
کھڑکشاں سہم کر، زرد پڑنے لگی
سب یہ سمجھے قیامت قریب آگئی

کیا ہوا، کیوں ہوا، اور کیسے ہوا
کچھ نشہ شوق نے سرگوشیوں میں کہا

وہ یتیم آئمہ کا خدا کا نبی
آج طائف کی گلیوں میں زخمی ہوا

اُن کی ہمت کا یہ حوصلہ دیکھئے
دشمنوں کو جو دی ہے سزا دیکھئے
اُن کے اخلاق کا مرتبہ دیکھئے
اُن کی رحمت کا ہے معجزہ دیکھئے

ہاتھ اٹھے اور لب سے یہ نکلی دعا
میرے پروردگار اِن کو رستہ دکھا
میرے اللہ اِن کی خطا کو معاف کر
یہ نہیں جانتے کر رہے ہیں یہ کیا ؟

نذرِ حقیقت

بحرِ استبداد میں مردِ خدا درکار تھا
 کشتیِ انسانیت کو ناکِ خدا درکار تھا
 راہِ ہستی کو تڑپ تھی کوئی سنگِ میل ہو
 کاروانِ وقت کو اک نقشِ پادرکار تھا
 آنے والا ہر نیرِ وقت عریاں ہو گیا
 صفحہٴ تاریخ کو اک آئینہ درکار تھا
 کر بلاکبِ وقت اور جغرافیہ میں قید ہے
 مالکِ لوح و قلم کو حاشیہ درکار تھا
 تا قیامت تشنگی کی لاج رکھنے کے لئے
 بانیِ جمہور شاہِ کر بلا درکار تھا

عشق کی محفل نہایت پر ضیا تھی تم نہ تھے
 قسین اور فریاد تھے میں تھا وفا تھی تم نہ تھے

ہجر کی کتنی کڑی سی، لمبی سزا تھی، تم نہ تھے
 رات بھر جس نے مجھے چھیڑا ہوا تھی، تم نہ تھے

عمر بھر محرومیاں، ناکامیاں، مجبوریاں
 گردشِ دوراں نہایت با وفا تھی تم نہ تھے

خوش بیا سی، خوشنالی، تازگی، زندہ دلی
 موسمِ گل میں تمہاری ہر ادا تھی تم نہ تھے

ٹپس کیا، کرب و کسک، رنج و محن، درد و خلش
 میری قسمتِ زندگی کی ہر عطا تھی، تم نہ تھے

جب ضیاء پلکیں بچھا کر، گوشِ بر آواز کھا
 صرف مستقبل کے قدموں کی صدا تھی، تم نہ تھے

نامساعد وقت تھا موسم کی مجبوری بھی تھی
بادِ صرصر بھی خزاں تھی عقل سے دوری بھی تھی

برگِ آوارہ بنا سازش نہ ٹوٹا شاخ سے
اس میں پورے پیر کی خاموش منظوری بھی تھی

وقت کے حاکم کا تھا کچھ ہاتھ کچھ تقدیر کا
دار تک جو لے گئی وہ شانِ منصوری بھی تھی

چھین گئی جاگیر مجھ کو نوکری کرنی پڑی
یوں تو میری منتظر سرطکوں پہ مزدوری بھی تھی

عمر کے رشتے بھلا اک پل میں کیسے ٹوٹتے
زہن میں مقرر امنِ شک تھی دل میں درخیزی بھی تھی

کامیابی حیل کے بھی تھی ترے در تک ضیاء
پیری ناکامی میں شامل تیری نمودری بھی تھی

بِابِ ہوش و خرد کس قدر ادھوری ہے
میری نہیں مری منزل کی ٹانگ لٹی ہے

زمینِ فکر و نظر کے حقیر زبوں سے
حصارِ ذات کے سورج نے بھیک مانگی ہے

خلاء کی گرد بنی نورِ میرے چہرے کا
صلیبِ وقت صدامیرے خوں کی پیاسی ہے

سفرِ مدام سفرِ تیرے نہیں سمندر کی
ازل سے میری انا مجھ کو لے کے ڈوبی ہے

حدودِ شام میں سورج نے خود کشی کر لی
گھٹن کے کرب سے چہروں پہ دھوپ پھیلی ہے

ضیاء کے قتل سے دستِ شفق میں مری ہے
جو ذات ٹوٹ کے بکھری حیات بکھری ہے

میں گرد گرد نہیں قیس کو بگو کی طرح
متہارے دل میں ہوں میں نخل آرزو کی طرح

ترا وجود مجھ تشنگی کچھ اور بھی ہے
میں تیرے قرب سے بہتا ہوں آبِ ہو کی طرح

نمازِ عشق کی پاکیزگی سے واقف ہوں
ترا خیال ہے میرے لئے دھن کی طرح

میں بے زبان ادھر، اور آگ، دھڑ بلب
خوشیوں کے بھی دفتر میں گفتگو کی طرح

پٹے لباس میں رہ کر بھی بیش قیمت ہوں
کسی غریب کے ایمان و آبرو کی طرح

اکل رہا ہے سہرا یہ فیض موسمِ گل
چھلک رہی ہے جوانی بھرے صبو کی طرح

کسی کے دل کمر درتکے میں مثل گل ہے صنار
ہنسی ہے دستِ خالی میں وہ لہو کی طرح

میخواروں سے نسبت ٹہری، میخانے میخانے ٹہرے
 تشنہ لبوں کو دیکھ کے پھلکے پیمانے پیمانے ٹہرے

یہ پوچھو ان کی محفل میں، 'فرز انوں پر کیا گندری
 دیوانوں کی بات نہ پوچھو، دیوانے دیوانے ٹہرے

رُخ سے نقابِ رخ کو ہٹا کر سامنے آؤ تو ہم جانیں
 اُڑتی ہوئی شہرت تو سستی ہے افسانے افسانے ٹہرے

ہوش و خرد کو ہم کیا جانیں سودِ زیاں کی کیا بچائیں
 جانِ تصدق کر دیتے ہیں پروانے پروانے ٹہرے

تو ہے حنیاء کا ناز ہے تجھ پر اسکو بیوں سے لٹوہ ہے
 جب تو نے یہی بات نہ پوچھی، بیگلے بیگلے ٹہرے

غم نہ اتنا ہو کہ ہر فکر سے بے غم کر دے
میرے اللہ! ذرا میرا لشکم کم کر دے

پائے محبوب کے صدقے میں کرم ہو مجھ پر
دل کو آئینہ بنا چشم کو پرہیزم کر دے

یہ جو موتی مری آنکھوں کو دئے ہیں تو نے
ان کو گلہائے سخن پر درِ شبنم کر دے

نسبت شیر خدا دی ہے تو ان بچوں کی
فکر فردا کو عطا، جرأتِ ضعیفم کر دے

فرض ہے جہدِ بقاء میں مرا حصہ لینا
میرے زخموں کو عطا، وقت کا مرہم کر دے

انقلابات تری مست نگاہی یہ نثار
ساقیا دور چلے، زلف گو برہم کر دے

وقت بے چارہ ہے، بوڑھا ہے، نہ سمجھ رہا ہے
اب ذرا جان ضیاءِ رقص کو مدہم کر دے

بتان سنگ مرمر بولتے ہیں
مرے سینے سے لگ کر بولتے ہیں

کھان ہے خامشی ہی گونجتی ہے
حقیقت یہ ہے پھتر بولتے ہیں

ہے مظلوموں کے اوپر سخت پہرہ
ستم یہ ہے ستم گر بولتے ہیں

جو گھٹ کر مر گئے وہ کیا کہیں گے
مگر جلتے ہوئے گھر بولتے ہیں

لب و لہجہ بدل لیتے ہیں اپنا
وہ جب کھا دیا پہن کر بولتے ہیں

مرے پیر کھوں کے تلج و تخت اکثر
عجائب گھر کے اندر بولتے ہیں

ضیاء معشوق میرے کم سخن تھے
رقیبوں کی وہ شہ پر بولتے ہیں

روشنی کھو کے ضیاء دیدہ دری آوے ہے
بعد لٹنے کے ہمیں راہبہری آوے ہے

اس میں تخریب کا پیغام نہ پوشیدہ ہو
فاختہ لے کے کوئی شاخ ہری آوے ہے

ان کے دامن میں سلامت تو نہ فرزانہ سمجھ
چند دیوانوں کو بھی بچہ گری آوے ہے

بھول عریاں بھی ہے ملبوس میں ستور بھی ہے
اس سلیقے سے کسے جامہ دری آوے ہے

مجھ سے پتھر کو جلاؤ دے کے بنایا مجھوں
میری لپٹی کو ضیاء شیشہ گری آوے ہے

بھگی بھگی رات جب ناگن سی بل کھا جائے ہے
من کو ساون کی جھڑی کچھ اور ترسا جائے ہے

دیکھئے پھر دست قاتل سے پکارے ہے لہو
سوچئے! تاریخ کیوں اپنے کو دہرا جائے ہے

کہکشاں بھی در دکی شدت سے ہو جاتی ہے زرد
رات کے پچھلے پہر، جب یار تڑپا جائے ہے

تیری دوزخ سی جوانی، اے حسین شعلہ بدن
دل میں جنت کی تمنا، اور بھڑکا جائے ہے

کب بدل جائے زمانہ، کب بکھر جائے باب
وقت کے غرماندوں پر بھی وقت آجائے ہے

گردشِ دوراں، کبھی ملتی تو ہے، لیکن ضیاء
نازنینِ نظرسِ ملا کر اور شرما جائے ہے

جناب شیخ کو دستار پارسائی ملی
کبھی ملا مجھے ساغر کبھی صراحی ملی

ملی ہے کوئی نعمت بتا نہیں سکتا
کسی کے در کی مجھے جس گھڑی گدائی ملی

ترے طفیل مجھے ذوقِ سجدہ گاہی ملا
تری عطا کہ تجھے آج بادشاہی ملی

کسی فقیر نے بخشا ہے کون سا اعجاز
خدا ملے گا یقیناً مجھے خدائی ملی

نہ دشمنوں کی شکایت نہ دوستوں کا گلہ
ملی ضیاء کو جو نسبت تو خالقِ ہی ملی

ہم سے ملتا ہے زمانہ جو رقیبیا نہ ملے
ہم زمانے سے ملے ہیں تو شریفانہ ملے

ہم کسی دور میں بھی ان کے مقابل نہ رہے
چندا حجاب ہمیشہ ہی حریفانہ ملے

حسن اخلاق سے ملنا بھی جو اس مردی ہے
کوئے اغیار میں ہم سب سے رفیقانہ ملے

اس کو یہ ضد ہے کہ وہ چاندیہ بھوکے گا مگر
اس کو اطوار ہی بچپن سے مرلیضانہ ملے

راہ میں رکنے رکانے کے نہیں ہم قائل
چاہے مشکل کوئی آئے کہ یہی خانہ ملے

وضع داری ہے ضیاء وضع پہ اپنی قائم
ہم ملے جس سے یہ انداز جیبیانہ ملے

غم کی حدت نہ بڑھا چاند پگھل جائے گا
آتشِ عشق بجھا چاند پگھل جائے گا

تیری قسمت ہے سدا دھوپ میں چلتے رہنا
اس کے رستے میں نہ جا چاند پگھل جائے گا

کرب کو جامہ اظہار نہ ملنے پائے
سانہ پر لیت نہ گا چاند پگھل جائے گا

تشنگی دیکھ کر ڈھل جائے نہ ساغر میں کہیں
جامِ خالی نہ اٹھا چاند پگھل جائے گا

اے میری رشکِ قمرِ ماہِ جبیںِ ماہِ لقا
رُخ سے پردہ نہ اٹھا چاند پگھل جائے گا

تو ہے کیوں درد کے سورج کا گرِ قمار ضیا
اپنے حالات بتا چاند پگھل جائے گا

سہر دن وہی پرانی دعا اور کچھ کہو
لفظوں کے سلسلے کے سوا اور کچھ کہو

بندہ ہوں مجھ سے ذکر کرو میری ذات کا
بہر خدا خدا کے سوا اور کچھ کہو

زخمی سیوئی کہیں یہ کہیں توڑتی ہے دم
کیسی وفا کہاں کی وفا اور کچھ کہو

گر یہ بہار ہے تو خزاں کس کا نام ہے
یہ گل کھلا ہے کوئی نیا اور کچھ کہو

لازم ہے اب کے ہاتھ اٹھیں اور لب بلس
بے کار ہو گئی ہے دوا اور کچھ کہو

اس دور میں یزید بھی ہے کر بلا بھی ہے
تاریخ کہہ رہی ہے ضیاء اور کچھ کہو

شناخ گلبار پر شراب اُگے
پھر چناروں تلے شباب اُگے

آسماں پر کھلا ہے زرد گلاب
سبز کھیتوں سے آفتاب اُگے

سر زمین عذاب پر برسا
ابرِ رحمت تو پھر ثواب اُگے

زلفِ بچیاں کی اپنی دُنیا میں
ساعتِ تادفوں کے ماہتاب اُگے

عرشِ اعظم ہے ایک بنجر کھیت
اب زمیں سے نئی کتاب اُگے

دہنِ افساں میں جب خیال آیا
پردہِ غیب سے جواب اُگے

اپنی اوقات جانتے ہو ضمناً
وقت سے پہلے کیوں جناب اُگے

شہید تنہائی میں کوئی مرے ساتھ آیا نہ تھا
میں جہاں پر تھا وہاں پر دور تک سایہ نہ تھا

انقلابی بن رہے ہیں دشمنان انقلاب
ایسا دھوکا تو زمانے نے کبھی کھایا نہ تھا

قوم ساری چیختی تھی اور تم خاموش تھے
لفظ ہمدردی تمہیں دنیا نے سکھلایا نہ تھا

امن اور انسانیت کے نام سے ڈرتے ہیں لوگ
یہ تاثر جو کبھی الفاظ نے پایا نہ تھا

آپ نے جو کچھ کیا جمہوریت کے نام پر
بادشاہوں نے کبھی ایسا ستم ڈھایا نہ تھا

اپنا اپنا وقت ہے معیار ہے اور طرف ہے
کھب گیا ہے کوئی آنکھوں میں کوئی بھایا نہ تھا

تم ضیاءِ ملہار کے عاشق تھے کیسے جل اٹھے
تم نے دیکھ تو کبھی اس رنگ میں گایا نہ تھا

بے لوث حقیقت کو کچھ رنگ گماں دے دے دو
مقتل کا لہو چپ ہے قاتل کو اماں دے دے دو

تھوڑی سی جگہ اُس کو دامن میں ارم دیگی
اب تم بھی دعاؤں کا اک باغ جہاں دے دے دو

عالات کی چوکھٹ کو جب بھیٹ ہی دینی ہے
دو ہاتھ کی تھالی میں نمود اپنی زباں دے دے دو

دستور سے خارج ہے پیاسوں سے رواداری
پانی جو کوئی مانگے تم آب سناں دے دے دو

جب زہر ہی دینا ہے سچ کو تو تامل کیا
اے وقت کے سقراطو، تم چاہے جہاں دے دے دو

انصاف کا نوحہ کیا، بس میر کا دوہا ہے
بہتر ہے مرے سر کو اک سنگ گراں دے دے دو

تری نگاہ مرا مدعا لگے ہے مجھے
ہر ایک لمحہ نئے سال سا لگے ہے مجھے

کس اعتماد سے کانتوں کے بیچ ہے خداں
ہستی کلی کی تمہاری ادا لگے ہے مجھے

سر نظر ترا چہرہ ، سر قدم تری یاد
نفس نفس تری آواز پا لگے ہے مجھے

بہت سکون سے ہوں تیرے غم کی جنت میں
ترے خیال کی ٹھنڈی ہوا لگے ہے مجھے

مزاج وقت نے شاید بدل دیا چولا
جی بھی تو پیرمغاں پارسا لگے ہے مجھے

ہر ایک آنکھ دکھاتی ہے رنگ پیرا
ہر ایک شخص مرا آئینہ لگے ہے مجھے

یہیں پہ کیوں نہ ضیاء غم کی دو پہر کاٹش
کسی کی یاد کا سایا گھٹا لگے ہے مجھے

کسی کے راز سرِ بزم کھولتا تو نہ کھتا
بلیک میل سے وہ نہ ہر گھولتا تو نہ کھتا

وہ اپنے گاؤں کے ماحول میں رہا جب تک
کبھی بھی یاروں کی جیبیں ٹوٹتا تو نہ کھتا

تمام رشتوں کی عزت کا پاس کھتا اس کو
یرائے بندِ قبا شب میں کھوتا تو نہ کھتا

ہمارے شہر کے کلچر سے وہ کھتا ناواقف
شراب پی کے سرِ راہ ڈولتا تو نہ کھتا

ہوئے ہیں چار ہجری دن اس کو منتخب ہو کر
وہ شخص پہلے کبھی جھوٹ بولتا تو نہ کھتا

تا خدا کو کس زمانے میں خدا سمجھا تھا میں
شاعرِ مفلس سہی، اچھا یا سمجھا تھا میں

دولت کو نین اپنی گرجا یا سمجھا تھا میں
آپ کیا سمجھے تھے جانے اور کیا سمجھا تھا میں

رنگِ کہنہ و صعداری میں بھی دھوکا کھا گیا
ساتھیازِ لہو کو سادہ کی گھٹا سمجھا تھا میں

ایک ہی شے ہے جو دو لفظوں میں بٹکر رہ گئی
زندگی سے موت تک ایک فاصلہ سمجھا تھا میں

عشق کی منزل پہ خود میری وفا ہے شرمسار
با وفا نکلے ہیں جنکو بے وفا سمجھا تھا میں

آج دیکھا ہے تو آنکھوں کو یقین ہوتا نہیں
آج تک حضرت ضیاء کو یار سا سمجھا تھا میں

خلائی دور کو تسخیر کر چکے ہوں گے
نئی صدی کے جیائے گزر چکے ہوں گے

بنام سازش خسرو خود اپنے تئیشے سے
ہمارے شہر کے فریاد مر چکے ہوں گے

وہ رہبرانِ زمانہ امامِ عیلم و سنہر
جو چاہئے تھانہ کرنا وہ کر چکے ہوں گے

مقامِ اہلِ زمانہ بہ خوفِ جنگ و جدل
خود اپنی موت کا سامان کر چکے ہونگے

نئے اُفق کی طرف تھی غزلِ رواں کچھ اور
جمالِ یار کے جلوے ستور چکے ہوں گے

ہمارے روز کے ہبکڑوں سے تنگ کے ضیا
زمین پہ اہلِ زمانہ اتر چکے ہوں گے

جو جاگنے میں نظر آیا خواب جیسا تھا
تمام قوم کے سر پر عذاب جیسا تھا

تڑپ تڑپ کے مرا ہے وہ روشنی کے لئے
سیاہ رات میں جو آفتاب جیسا تھا

خدا کے ملک میں یارو خدا کے بندے کا
جوازِ قتل بھی کارِ ثواب جیسا تھا

چمن تمام نہاک اٹھا اس کی خوشبو سے
وہ نیک شخص خزاں میں گلاب جیسا تھا

فقیر ملک جو انصاف سے نظر کرتا
تو چاک دامنِ یوسف جواب جیسا تھا

شکوہ اغیار ہے بوئے گل تازہ نہیں
نام ہے کس شے کا خوشبو ان کو اندازہ نہیں

تیری ہر خوش بھائی راخبن خاموش ہے
کوئی شکوہ، کوئی طعنہ، کوئی آوازہ نہیں

میرے لب پر گم ہے شکوہ اس میں ہے شامل غلوں
میرے چہرے پر فریب و مکر کا غمازہ نہیں

میرے در سے جب ملے مجھ کو طے جو ر و جفا
میرے جرم عاشقی کا کیا یہ خمیازہ نہیں

کاش یہ شے ٹپ سکے پیمانہ ہائے وقت سے
آپ کو میری وفا کا کوئی اندازہ نہیں

ظلمتوں کے قلب تک کیسے بھلا پہنچے ضیاء
سب دریچے بند ہیں اور کوئی دروازہ نہیں

آجائو کہ دل درد بھرا ٹوٹ رہا ہے
آئینہ احساس مرا ٹوٹ رہا ہے

اب اور نہ کھینچو مری اُمید کا دھاگا
تہذیب محبت کا سرا ٹوٹ رہا ہے

اے دخترِ شب رتس جنوں سارا نقیس سے
کیوں آج ترا جسم وفا ٹوٹ رہا ہے

حالات کچے زد میں ہے ابھی آج کا انسان
کس واسطے آئین نیا ٹوٹ رہا ہے

آرام گیا ، نیند گئی ، صبر و سکون بھی
کیا ہم پہ کوئی قہر خدا ٹوٹ رہا ہے

تم بارگاہِ درد میں جھک جاؤ ضیاء اب
افسوں شبِ ہجر و وفا ٹوٹ رہا ہے

چھپار باہوں نے نے سے دولتِ قافوں
کوئی دکھانے کی شے تو نہیں ہے سونہ دروں

تغیرات کی کالی گھٹا اٹھی ہے مگر
حواس قوم پہ چھائے ہیں گیسوئے شب گوں

مفادِ ملت بیضا کی منکر کل رہ بر
زباں پہ ہر ہے یہ بات میں کہوں نہ کہوں

کسی نے دور سے دعویٰ کیا "ہیں ہے کوئی"
کہیں قریب سے آواز آئی "میں بھی ہوں"

ابھی سلاسل و زنجیر میں مقید ہیں
تمہارے چاہنے والوں کا ہوتیوں افزوں

یہ آگہی جو ملی ہے تو روشنی نہ رہی
کہ حسن کچھ بھی نہیں ہے فقط نظرِ کافسوں

زمین کو اب بھی ضرورت ہے ابنِ آدم کی
ضیاء نہ چاند ستاروں پہ ماریے شبِ خوں

پر دہلی میں فکرو فن کے رہی، حبانِ فن کی یاد
جانِ بہار، حبانِ جہاں حبانِ من کی یاد

ہم مٹ گئے، حیات مٹی، دردِ مٹ گیا
اک رہ گئی تو صرف تری انجمن کی یاد

مہکے ہوں پھول جیسے کہیں لاشعور میں
یوں آ رہی ہے آج کسی گلبدن کی یاد

نکلی ہے آج قوسِ قزح آن بان سے
یا آسماں کو لائی تیرے بانگین کی یاد

ہر اک کلی جو چٹکی ہے فصلِ بہار میں
ہمراہ لائی ہے کسی غنچہ دہن کی یاد

جیتے ہیں اس اُمید پہ آئے گی ایک دن
اہلِ وطن کو ایک غریب الوطن کی یاد

موسیٰ ندی کے قرب میں رہتے ہو تم ضیاء
غزلوں میں کیوں ہے دادی گنگ و جمن کی یاد

دھوپ دی ہے تو سایہ ہاں بھی دے
جو ہیں بے گھر انہیں مرکاں بھی دے

ساز کے ساتھ ساتھ دے کچھ سوز
آگ کے ساتھ کچھ دھواں بھی دے

دل کو دل کا مقام بھی سمجھا
اس کو اپنا کبھی نشاں بھی دے

تیرے دستِ غطا میں سب کچھ ہے
خارِ بخشش میں گلستاں بھی دے

سیر کر لوں ترے سمندر کی
میری کشتی کو بادباں بھی دے

زیب و ترطاس ہو گیا ہے ضیاء
منکر دی ہے تو ترجماں بھی دے

تو شبِ ماہ میں اٹھ اٹھ کے بٹکتا ہوگا
اور میری ہی طرح چاند کو تکتا ہوگا

رات کی رانی بھی تسکین نہ دیتی ہوگی
زخیم یادوں کا سرِ شام جھکتا ہوگا

میری غزلیں ترے چوٹیوں پہ مچلتی ہوں گی
شاخِ گل پر کوئی بلبل جو جھکتا ہوگا

میں ہوں دوزخ میں مگر جنتِ آسائش کی
آتشِ گل سے ترا دل تو ^{دھکتا} سلکتا ہوگا

دیکھ کر چاند میں تصویرِ ضیاءِ دل تیرا
بھلے ناداں کی طرح اب بھی ہمکتا ہوگا

وطن سے دور بہت دور قید خانہ ہے
چین سے کچھ قفس تک بڑا زمانہ ہے

دلوں میں اہل سیاست کے صرف حوصلے ہوس
لبوں پر عظمت و تقدیس کا ترانہ ہے

ہر ایک شاخ سے نسبت ہے آج بھی مجھ کو
جہاں جہاں ہے دھواں میرا آشیانہ ہے

ہمارے ظرف کی وسعت کہ پاس عہدِ وفا
فریب کھائے ہوئے ہیں فریب کھانا ہے

ہے ایک عمر سے ویران وقت کا مقتل
مری تلاش میں مدت بھولی زمانہ ہے

جھنجھوڑتا ہے ضمیرِ عوام آج ضیاء
کہ زورِ بازوئے قاتل بھی آزمانا ہے

نظر زمانے کی نظروں میں ہم نے ڈالی تھی
شکست کھائی تھی پگڑھی مگر بچالی تھی

ہر ایک بات ادھوری تھی تیرے ذکر بغیر
ہر ایک ذات ترے سامنے سوالی تھی

ستارے، چاند اترتے تھے میری گلیوں میں
مرے شباب میں ہر بات لا آباوی تھی

جوان جذبوں نے ہاتھوں کی سخت محنت سے
خیال و خواب کی مقبیر خود نکالی ہے

تمہارے عشق میں ہم کو خراب ہوتا تھا
وہ بات ہو کے رہی ہے جو ہونے والی تھی

مرا خیال تھا کچھ دیر ٹرک کے مل بھی لوں
تمہارے شہر سے گذرا تو جیب خالی تھی

زہے نصیب ضیاء کی طرف بھی دور آیا
یہ اور بات ہے کہ ٹوٹی ہوئی پیالی تھی

قرب کی آگ کو دہکاؤ، بڑی سردی ہے
اور نزدیک مرے آؤ، بڑی سردی ہے

فاصلے مشترک احساس کو ٹھنڈک دیں گے
میری باہوں میں سمٹ جاؤ، بڑی سردی ہے

برف ہی برف ہے جس سمت نظر جاتی ہے
پیاری دھوپ میں آ جاؤ، بڑی سردی ہے

برف کے پھول چناروں سے گلے ملتے ہیں
آج موسم کی قسم کھاؤ، بڑی سردی ہے

دیکھ لو بہتا ہوا چشمہ بھی خشک ہے
تم مجھے چھوڑ کے مت جاؤ، بڑی سردی ہے

دو بدن ایک ہی کمبل میں گزر کر لیں گے
وقت کہتا ہے نہ شراؤ، بڑی سردی ہے

طفیل تاداں ہے ضیاء کوئی کھلونا ہے دو
شمعِ اُمید سے بہلاؤ، بڑی سردی ہے

ایک ہی رات تھی مگر تحفے جدا دیتی گئی
آپ کو خوشبو مجھے زنجیر یا دیتی گئی

یاد جاناں کی طبیعت کس قدر خوش ذوق تھی
موسم گل کی مجھے ٹھنڈی ہوا دیتی گئی

گردش دوراں نے سمجھا ہے مجھے میں نے اُسے
میں جدھر بڑھا گیا وہ راستہ دیتی گئی

تیری آشفتمزاجی دور رس نکتہ شناس
آنے والے موسموں کا تجزیہ دیتی گئی

وہ جماعت کم تھی کیا لیتی کسی سے انتقام
زخم کھا کر دستِ قاتل کو دُعا دیتی گئی

نو جوانی موسمِ گل میں کھلا کر گل تئے
جھیل سی شفاف آنکھوں کو حیا دیتی گئی

میری آوارہ مزاجی سرخرو ہو کر ضیاء
نفسری ہاتھوں کی زمینت کو حنا دیتی گئی

میں ریزہ ریزہ ہوں سینے سے مت لگاؤ مجھے
میں خوابِ شب ہوں یہ بہتر ہے بھول جاؤ مجھے

میں انگلیوں میں چبھوں گا، لہو رلاؤں گا
بکھر چکا ہوں سرِ راہ مت اٹھاؤ مجھے

نیازِ خاک کو صد ناز آسماں نہ کرو
میں نقشِ پا ہوں نہ سجدوں سے تم اٹھاؤ مجھے

ابھی امید کی کونیل نے آنکھ کھولی ہے
میں تخیلِ سبز ہوں مت اگ سے جلاؤ مجھے

غریب ماں کی دعا ہوں چراغِ شام ہوں میں
میں جانشین ہوں سورجِ کاملت بجھاؤ مجھے

ہم لوگ اب بھی کوہِ نذا کے سفر میں ہیں
لیکن سمجھ رہے ہیں کہ اپنے ہی گھر میں ہیں

موت و حیات دونوں کے لب پر ہے الاماں
ایسے بھی معجزے مرے زیر و زبر میں ہیں

اے اہل کار و انِ ادب جاگتے رہو
اب بھی سفید پوش اسی رہگزر میں ہیں

دیکھو تو مثلِ سنگ ہیں پر کھو تو مثلِ لعل
ایسے نوادرات بھی میری نظم میں ہیں

کچھ یار آستینوں میں خنجر لئے ضیاء
ستے ہیں ایک مردِ خدا کی خبر میں ہیں

دینے لگے ہیں یار دغا جا گئے رہو
اے ساکنانِ شہر وفا جا گئے رہو

اے یاسبانِ حرمت امن و اماں اٹھو
بڑھنے لگے ہیں دستِ جفا جا گئے رہو

جھپکی پلک تو جان کو صدیاں گزر گئیں
دی ہے نئی سحر نے صدا جا گئے رہو

تدبیر کے چراغِ جلاؤ کہ رات ہے
وقتِ دیر ہو نہ جائے خفا جا گئے رہو

بندوں کے واسطے بڑا نازک مقام ہے
سنتے ہیں سورہا ہے خدا جا گئے رہو

آواز دے رہے ہیں اندھیرے قریب سے
سورج بھی سو گیا ہے ضیاء جا گئے رہو

تشنگی کو بھول کر ہم جام کی باتیں کریں
صبح کی مانگیں دعائیں شام کی باتیں کریں

چاند مڑھلنے لگا اور چاندنی سونے لگی
رات بیتی جا رہی ہے کچھ کام کی باتیں کریں

ہجر کے لمحے ٹھکے ماندے بہت بو جھیل ادا اس
عاشقو آؤ! گل و گلشن کی باتیں کریں

آنے والی نسل اس سے کچھ تو عبرت پائے گی
ہم دلِ بر باد کی بدنام کی باتیں کریں

مسکندوں میں، بستکدوں میں، زندگی کا پیٹھ ضیاء
ہے درِ توبہ کھلا اسلام کی باتیں کریں

پینے کے لئے ہین نہ پلانے کے لئے ہیں
یہ ساغر نو صرف دکھانے کے لئے ہیں

ہم وقت کو آئینہ دکھانے کے لئے ہیں
تہذیب کا معیار بڑھانے کے لئے ہیں

الفاظ جو نشتر کی طرح اترے ہیں دل میں
یہ زخموں پہ مرہم بھی لگانے کے لئے ہیں

اب یہ بھی مناسب نہیں پر آنکھ نہ نم ہو
کچھ اشک فقط آگ لگانے کے لئے ہیں

یہ موج ہوا، نکہت گل، لغز و بلیل
غمنوان یہ سارے ترے آنے کے لئے ہیں

ہن باس تو دنیا کو دکھانے کے لئے ہے
تساریاں راون کو مٹانے کے لئے ہیں

تن کو کسی زنجیر کا پابند نہیں ہے
فن کار ضیاء سوائے زمانے کے لئے ہیں

تحتِ فلک سے جب مہِ خوش رو اتر گیا
لیلائے شب کا پرچم گیسو اتر گیا

تہذیب کے حسین مراسم کی آڑ میں
گل پیرہن کا خلعتِ خوشبو اتر گیا

دل ڈھونڈتا ہے عشق کی منزل کہاں گئی
دو دن میں سر سے پیار کا جادو اتر گیا

بھولی ہوئی جو بات کوئی یاد آ گئی
شیشے میں کوئی قیمتی آئینہ اتر گیا

مجھ کو تری تلاش میں اپنا پتہ ملا
یہ کیا ہوا ! نقابِ من و تو اتر گیا

مے اور بھی گلاب کی رنگت میں ڈھل گئی
ساغر میں عکسِ ساقی گلو اتر گیا

صدیوں سے تشنہ لب تھا ضیاءِ عنید آ گئی
دلِ دل کی جستجو میں لب جو اتر گیا

بکھتے ہوئے شعلوں کو ہوا ہم نے ہی دی ہے
اس دل کو تر پنے کی سزا ہم نے ہی دی ہے

عریاں جو بدن تھے انہیں ملبوس دیا ہے
تہذیب و تمدن کی ردا ہم نے ہی دی ہے

شامل ہے ہمارا بھی لہو رنگ چمن میں
کلیوں کو تبسم کی ادا ہم نے ہی دی ہے

کو ہسار و بیاباں میں اڑائے ترے پرچم
دریاؤں کے سینے پہ ندا ہم نے ہی دی ہے

ہر فن کو نیا موڑ نیا حسن دیا ہے
ہر فن کو کاغذ کی قبا ہم نے ہی دی ہے

اے دور پر آشوب ذرا مڑ کے نظر کر
تو کے میں تجھے رسم وفا ہم نے ہی دی ہے

ہر سنگ کو حکمت کا سبق ہم نے پڑھایا
ہر رنگ کو کھلنے کی ضیا ہم نے ہی دی ہے

آگ پانی میں لگا کر دیکھیں
اُس کو آئینہ دکھا کر دیکھیں

زخمِ تدبیر بھی کھائیں ریل کر
شجرِ اُتمید پلا کر دیکھیں

نرد سے قوم کا رشتہ کیا ہے
ہم بھی تاریخ اٹھا کر دیکھیں

نظمِ مے خانے کی بنیاد ہے کیا
رند ساقی کو پلا کر دیکھیں

ذوقِ تزنین ! رہِ صبحِ وصال
حجر کی شام سجا کر دیکھیں

پھول ہے خار ہے یا انساں ہے
اُس کو سینے سے لگا کر دیکھیں

ضد ہے اربابِ سیاست کی ضیاء
شہر کا شہر جلا کر دیکھیں

تجھے آواز دوں کیسے یہاں سے
بہارِ گمشدہ لاؤں کہاں سے

مرے تنِ امن میں کانٹے چھو رہے ہیں
کہوں جانِ بہاراں کس زباں سے

اُجالا بھیک میں اب مانگتے ہو
چراغِ آفتاب سے

جوانی کتنی سادہ لوح نکلی
ستارے ٹوٹ لائی کہکشاں سے

اُبھر آیا اُسی نسبت سے وہ بھی
جہیں اٹھٹی جو سنگِ آسمان سے

پہنچ ہے میرے مسجدوں کی لمکھان تک
مکین تکلیف کر اب لامکاں سے

حاکمِ وقت نے مجمع میں سزائیں دی ہیں
ہم نے ہر حال میں خلقت کو دعائیں دی ہیں

غنیمت و گل نے اشاروں میں شکایت کی ہے
فصلِ گل تو نے ہمیں چاکِ قبائیں دی ہیں

تم بھی تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھو
کس نے بدلے میں جفاؤں کے وفاؤں دی ہیں

انقلابات نے ظالم کو بنایا منصف
اور مظلوم کو دروں کی سزائیں دی ہیں

اُس سفینے کے مقدر کا خدا حافظ ہے
جس کو طوفان نے ساحل سے صدائیں دی ہیں

بھیک میں دادِ سخن تو بھی ضیاءِ پائے گا
تو نے غزلوں کو ترسم کی سزائیں دی ہیں

تمام عمر جو کانٹوں کے آس پاس رہے
 رہے نصیب گلوں سے بھی روشناس رہے

بنام گردشِ دوراں ترے دیئے ہوئے غم
 کبھی حبا بھی ہوئے ہیں تو آس پاس رہے

ترے مزاج کو نسبت ہے موسمِ گل سے
 ترے طفیل میں ہم سے بھی خوش لباس رہے

کسی بدن میں رچا ہے مری غزل کا جمال
 مری غزل میں کسی گلبدن کی لباس رہے

اپنی پلکوں پہ کوئی خواب سجائے رکھئے
اپنے خاکوں میں کوئی تاج بنائے رکھئے

عین ممکن ہے، بہاروں کا گزر ہو جائے
خانہ دل کے در و بام سجائے رکھئے

کامیابی تو بڑی رات گئے آتی ہے
من کے آنگن میں کوئی دیپ جلائے رکھئے

آپ کے پاس شرافت کا اگر جوہر ہے
اس زمانے کی نگاہوں سے بچائے رکھئے

زندگی جن کی لطافت سے عبارت ہے ضیاء
ایسی یادوں کو کلیجے سے لگائے رکھئے

شامل جو ایک عمر مرے بھائیوں میں تھا
جب گھر مرا جلا تھا، وہ بلوائیوں میں تھا

تاریخ میں کہاں سے مرا نام دیکھنا
میں بھی تمہارے حسن کے شیدائیوں میں تھا

کچھ میرا عشق بھی مجھے بدنام کر گیا
کچھ تیرا حسن بھی مری رسوائیوں میں تھا

اس سرد ملک میں وہ مزہ کس طرح ملے
وہ لطف جو کہ گاؤں کی پروائیوں میں تھا

اس تیز و تلخ لے میں دل مضطرب نہ ڈھونڈ
امرت جو اپنے دیس کی شہنائیوں میں تھا

ترک تعلقات کی افواہ اڑ گئی
دہنِ رقیب حاشیہ آرائیوں میں تھا

کڑوے صتیاء کے بول تھے لہجہ تھا کھردرا
شامل مگر خلوص بھی گہرائیوں میں تھا

منزل بنام را ہگزہ کون دے گیا
بے سمت راستوں کا سفر کون دے گیا

موسم بدل گیا ہے ترے انتظار میں
پیوہوں کو میرے غم کی خبر کون دے گیا

آن شوخ آنکھڑیوں میں حیا کھیلنے لگی
جھوٹی کو احتیاط نظر کون دے گیا

مجبور نے سلاسل و زنجیر توڑ دیں
مظلوم کی دعا میں اثر کون دے گیا

یہ غم شناس آنکھ شناسا لگی ضیاء
گاہاے تور داغ جگر کون دے گیا

کوئی شہلا، کوئی روزی، کوئی زہرہ دیکھوں
جی میں آتا ہے کوئی خواب سنہرا دیکھوں

حکم دے دوں گا قلم کو کہ وہ موتی لکھے
کوئی آنسو تری پلکوں پہ جو چھٹہرا دیکھوں

تازیانہ سارے طوفانی مری فطرت کے لئے
یہ سمندر ہے کہاں اور بھی گہرا دیکھوں

اُوہ مظلوم سے ہلتا تھا کسی دور میں عرش
آج میں ارض و سموات کو بہرا دیکھوں

لاکھ بکھرا سہی ہر حال میں سچ کہتا ہے
کیوں نہ ٹوٹے ہوئے آئینے میں چہرہ دیکھوں

جن کی آنکھوں میں تھے شعلے سے بغاوت کے ضیاء
ان کے ہونٹوں پہ روایت کا پہرا دیکھوں

دارمکاری دھتا مگر ہلکا لگا
دستِ خنجر بھی مجھے اپنا لگا

خودکشی کر لی کسی گمراہ نے
زندگی کے نام پر دھبہ لگا

اس کا گھر بے گاؤں سے بالکل الگ
شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ لگا

اس ہوا میں زہر کیسے آگیا
شہر میں چلتے ہوئے دھڑکا لگا

میں نے سیرابی کی لذت پائی ہے
اے ندی! تجھ کو بتا کیسا لگا

کچھ نہ کچھ قیمت تو دینی تھی ضرور
وہ فتح پا کر شکستہ پا لگا

اس قدر تنہا نہ دیکھا تھا کبھی
تیرا بندہ آج تجھ جیسا لگا

میں چراغ رہ گزر رہوں میں ہوا میں جل رہا ہوں
میں کسی غریب ماں کی سرِ شام کی دُعا ہوں

نہ ترنم بہاراں ، نہ ترانہٴ شبستاں
میں شکستہ سازِ دل کی کوئی دکھ بھری صدا ہوں

کسی نورتن سے رشتہ ، نہ محل سے کوئی نسبت
جہاں کھائی میں نے کھو کر وہیں اٹھ کھڑا ہوا ہوں

میری خاک نقشِ پا کی ابھی منتظر ہے منزل
جسے رہ گزر نے دھوٹا ، میں وہی شکستہ پا ہوں

شبِ یحز و غم کے مارو ، مرا تذکرہ ادب سے
نئے دور کا ادب ہوں ، نئی صبح کی ضیاء ہوں

زندگی کے باغی کو بھیرا مان دے دی ہے
مصلحت کی چوکھٹ پر دل نے جان دے دی ہے

ہم سیاہ فاموں کو بے زبان کشتوں کو
دور کے مصائب نے خود زبان دے دی ہے

ذکرِ قامت و قد کا آن کے زیور دکر کے
طالباتِ کالج کو ہم نے نشان دے دی ہے

جو ہر شرافت نے اور حیا کے زیور نے
اک غریب لڑکی کو آن بان دے دی ہے

ہفتے ہفتے ہوئے سے تیر دل پہ پھینکے گا
اُس شیریں بچے کو کیوں کمان دے دی ہے

وقت کے پروں اڑ کر چاند پر ضیاء پہنچے
دمشکِ نارِ سالی میں، جا اذان دے دی ہے

کر بلا ڈھونڈتی پھرتی ہے نکل میرے دوست
چھوڑ کر شہر و فادشت میں چل میرے دوست

ہم غریبوں کے سدا ہاتھ کٹے جیب کٹیں!
زندگی بیتی گئی تاج محل میرے دوست

یہ جو تار ہیں مفلس ہیں مرے اپنے ہیں
کاش کیچڑ میں کھلے کوئی کنول میرے دوست

جو ہے قاتل وہی منصف ہے کہاں کا انصاف
واسطے اپنے یہاں آج نہ کل میرے دوست

میٹھی باتوں کے عوض عقل کو گروہت رکھ
راہزن لیتے ہیں اب بھیس بدل میرے دوست

وقت نکلا ہے کہ مردوں میں مسیحا ڈھونڈے
اے ضیاء چھپر کوئی تازہ غزل میرے دوست

ماضی گزر چکا ہے اب روئے حال دیکھوں
 بیتی ہے شامِ حیراں صبحِ وصال دیکھوں

ایسی گھڑی بھی آئے اے مہرِ ماہِ الفت
 تو لا جواب تکے میں بے سوال دیکھوں

شہرِ متلی میں یارب ایسی بہار آئے
 صدمہ و سال دیکھیں صدمہ و سال دیکھوں

خونِ حبِ گریہ یارب فن کو کمی نہ دینا
 ایسا سرور دے دے جو لازوال دیکھوں

بے ننگ و نام ہو کر آیا ہوں تیرے در پر
 میں بے کمال ہو کر تیرا کمال دیکھوں

چند لمحوں کے شائستے میں
غمِ گزری تجھے بھلانے میں

کھیں مسیحا کا ذکر چھپڑا ہے
جہان سی پڑ گئی منانے میں

لوگ رفتار اپنی بھول گئے
زندگی سے قدم ہٹانے میں

اُس سے باہر ملے وہ ناصح تھے
آدمی تھے شراب خانے میں

رات کی دسترس یہ طعن بھی ہے
ایک غنچے کے مسکرانے میں

ہم نے پیدل سے مات کھائی ہے
ہم بھی ہسیر و تھے اک زمانے میں

کمرۂ مجبور یوں کا ذکر ضیاء
سب ہیں مجبور اس زمانے میں

زندگی کے نقیب ہیں ہم لوگ
عاشقان صلیب ہیں ہم لوگ

باغیاں کے حبیب ہیں ہم لوگ
فطرتاً عندلیب ہیں ہم لوگ

بعد مرنے کے یاد آتے ہیں
کس قدر خوش نصیب ہیں ہم لوگ

ہر زمانے میں دہر پیتے ہیں
ہر صدی کے طیب ہیں ہم لوگ

عرش کے پار ہے مکاں اپنا
ہر وطن میں غریب ہیں ہم لوگ

ہم پر پیچھاؤ دور دور سے ہے
ہر طرف سے قریب ہیں ہم لوگ

گو ترستے ہیں روشنی کے لئے
ظلمتوں کا نصیب ہیں ہم لوگ

میرے وجود یہ اک سائباں سا لگتا ہے
وہ آدمی ہے مگر آسماں سا لگتا ہے

جو جانتا ہی نہیں فکر کیا ہے فن کیا ہے
وہ ناشناسِ سخنِ قدرِ داں سا لگتا ہے

ہجومِ یاس میں بھی مسکرا کے ملتا ہے
وہ زخمِ زخمِ سہی گلستاں سا لگتا ہے

وہ بولتا ہے نگاہوں سے اس قدر اُردو
خموش رہ کے بھی اہلِ زباں سا لگتا ہے

جہاں پہ دام نہ دانہ ہے، صرف تنکے ہیں
کسی کا پیار مجھے آشتیاں سا لگتا ہے

یہ غیر ملک بھی احساس کے جھروکوں سے
تکبھی تکبھی مجھے ہندوستان سا لگتا ہے

میری کم آگہی کہیں نہ گئی
شدتِ اشتہائی کہیں نہ گئی

زخمِ پر پھر خاک چھڑکتے ہیں
اُن کی چارہ گری کہیں نہ گئی

لاکھ تہذیب نے سنوار دیا
حسن کی سادگی کہیں نہ گئی

وقت کی بے رخی نے کوشش کی
میری زندہ دلی کہیں نہ گئی

جتنی راتوں ضیاء رہا زندہ
سجبر کی شب کبھی کہیں نہ گئی

دولت کا ثبات بھی کم ہے
کس قدر قیمتی تر ا غم ہے

کون آنسو ہمارے پونچھے گا
آنکھ جو بھی ملے ہے پر ستم ہے

میکدوں نے نظر چرائی ہے
میری آنکھوں میں کون سا غم ہے

روشنی روشنی کی رسوائی
زندگی زندگی کا ماتم ہے

جام و مینا کی خیر ہوساقتی
ریشنگی کا مزاج برہم ہے

ہے سحر کا مجھے یقین لیکن
رات لمبی ہے زندگی کم ہے

شمع^{شعلہ} آرزو ہے بجھنے کو
چاند تاروں میں بھی ضیاء کم ہے

لاکھ بدلا بھیس لیکن صاف پہچانے گئے
رند بن کر شیخ صاحب گز چہ میٹھانے گئے

دیکھ کر مجھ کو مصیبت میں کنارہ کر گئے
شکریہ اے دقت تیرا یاد پہچانے گئے

منزلِ سود و زیاں پر رک گئے اہلِ خرد
بے خطر اے خوف تجھ تک تیرے دیوانے گئے

دیر تک وسیر و حرم میں جانے کیا باتیں ہوئیں
دور تک دل کے تعاقب میں صنم خانے گئے

پارساؤ! دیکھ لو کیسا زمانہ آگیا
خود جو ہیں بہکے ہوئے اوریں کوٹھجانے گئے

بے قرار و بہار کے دن آئے
مے گسار و بہار کے دن آئے

ٹکڑے ٹکڑے بکھر رہا ہے چاند
ماہ یار و بہار کے دن آئے

عارض و لب پہ آگ دے گی
گلزار و بہار کے دن آئے

شاخساروں میں کھکشاں ابھی
چاند تار و بہار کے دن آئے

غم کے مار و اٹھاؤ جام و سبو
غم کو مار و بہار کے دن آئے

صندلی جسم سے اڑ ہی خوشبو
پیار ! پیار و بہار کے دن آئے

اہلہ پا ضیاء بھی آئے گا
خارزار و بہار کے دن آئے

نہ دیکھ عالم حرام و پاکس ہے کتنا
مقام یہ کسی ہمت کو پاس ہے کتنا

کہیں جنون کی وحشت کہے نہ قاتل سے
ترے بدن پہ وفا کا لباس ہے کتنا

فسانہ کہنے کا الزام دوسروں پہ نہ رکھ
ترا مزاج حقیقت شناس ہے کتنا

سوال کرنے سے پہلے ذرا نظر بھی کر
جواب دامنِ یوسف کے پاس ہے کتنا

ضیاء ایہ کیا ہے کہ اک سر پیرے کے قتل کے بعد
فقیہ ملک کا چہرہ اداکس ہے کتنا

زخموں کو سلیقے سے سجا کیوں نہیں لیتے
 ٹوٹے ہوئے شیشوں کی دعا کیوں نہیں لیتے

الفاظ کی سنگین عمارت سے نکل کر
 انکار کی کچھ تازہ ہوا کیوں نہیں لیتے

تکلیف تو آنے کی کنواں کر نہ سکے گا
 گر پیاس لگی ہے تو بجھا کیوں نہیں لیتے

آنکھوں میں نمی دیکھ کر سب لوگ مفسی گے
 تکلیف تبسم میں چھپا کیوں نہیں لیتے

مانگے کا آجالا تو نہیں فیض اکھاؤ
 مہتاب ہو سورج کی ضیاء کیوں نہیں لیتے

جب کبھی ہسکی چنبیلی، تیری یاد آئی بہت
پھر کسک ہونے لگی چلتی ہے پروائی بہت

آم کی ڈالی پہ کوئل کوکتی ہے بار بار
کٹنے کو دوڑتی ہے مجھ کو تنہائی بہت

اب مریض عشق بن کر ہو گیا میرا رقیب
چارہ گر کو کھتا کبھی زعمِ مسیحائی بہت

فصلِ گل بدلی کہ بدلا ہے مزاجِ غنڈلیب
نیم کی ڈالی پہ اس نے راگنی گائی بہت

چودھویں شب میں ضیاءِ سویا نہیں مدت ہوئی
کولی وعدہ یاد آیا، نیند گو آئی بہت

پر شکستہ ہے زیرِ دام ہے وہ
اور سمجھتا ہے تیز گام ہے وہ

چھپ ہی جائے گا وہ کہیں نہ کہیں
غیر شائع شدہ کلام ہے وہ

رہنروں سے بھی ہے علیک و سلیم
رہروں میں بھی نیک نام ہے وہ

وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے
واہ کتنا سبک خرام ہے وہ

چڑھتے سورج سے جھک کے ملتا ہے
فطرناً وقت کا غلام ہے وہ

رند کے لب دیکھ تشنہ کام سے
آتشِ سیال چھپکی جام سے

داستانِ دل کہاں سے چھیدتا
آپ آئے تھے کسی کے کام سے

چاہنے والو ! بڑی نزدیک ہوں
صبح نے آواز دی ہے شام سے

عشق جا پہنچا فرارِ دار تک
حسن چھلکا تھا فرارِ بام سے

میں ضیاء ہوں، روشنی ہوں، نور ہوں
تیرگی جلتی ہے میرے نام سے

تھی بحث ہر زباں پہ دوام و ثبات کی
لٹنے کی راہِ عشق میں ہم نے ہی بات کی

دیتے نہیں ہیں سائنس کی فرصت بھی شش جہت
مسموم کس قدر ہے فضا کائنات کی

مشاہدگی دہر میں ہم خود بگڑ گئے
آرائشوں نے ٹوٹ لی رونق حیات کی

برہم ہیں نسل و قوم و سیاست کے پیشوا
انسانیت کے دکھ کی ضیاء نے جو بات کی

خلوتوں میں انجمن آرائیاں
یاد ہیں ان کی کرم فرمائیاں

قطرہ خون کی فلک تک بستر
ایک مشت خاک کی گہرائیاں

کچھ فرشتے ہاتھ ملتے رہ گئے
کس نے لی توبہ شکن انگڑائیاں

حسن کو اک شرم دامن گیر ہے
عشق کے دامن میں صدر سوائیاں

لڑکھڑا کر رہ گئے دیر و حرم
میکدوں نے جب بھی لی انگڑائیاں

تیرے جلوؤں سے انہیں نسبت کہاں
چاند سورج ہیں تری پر چھائیاں

نام سے کس نے ضیاء آواز دی
بج اٹھی ہیں چار سو شہنائیاں

قطعات

فرش سے عرش تک قیامت تھی
جسم فانی کی تھی شب معراج
ساقیا تیری دلنشین ہستی
چاند تاروں سے لے رہی تھی خراج

— ۰ ۰ ۰ —

شانِ قدرت عجیب باتِ ربی
اک معمہ یہ کائناتِ ربی
موت کو جب قریب سے دیکھا
سرِ برچشمہ حیاتِ ربی

— ۰ —

گنگناؤ کہ مسکرائے سحر
مسکراؤ کہ پھول کھل جائیں
اور دل کے قریب آجاؤ
آسمان و زمین مل جائیں

ایسی شمع جلائی ہے شب میں
جو ستاروں کو نور دیتی ہے
صبح دم اپنی لو کے سورج سے
زیدگی کو شعور دیتی ہے



یہ چنبیلی کا ایک پودا ہے
جس کے سائے میں ناگ بستے ہیں
زندگی اُس قدر حسین نہیں
جس قدر ہم اُسے سمجھتے ہیں



کان ہوتے ہوئے بھی بہرا ہے
صرف حرص و ہوس کا بندہ ہے
جیب سے دل خریدنے والا
آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھا ہے



گالوں پہ شفق دمک رہی ہے
یا صبح شام مل رہے ہیں
زلفوں میں ہے رات کا بسیرا
چہرے پہ گلاب کھل رہے ہیں

میرے محبوب یہ جبینِ خرم ہے
تو نے اپنا بنا لیا مجھ کو
عقل حیرانِ حقی کہ کیا مانگے
دل نے بن مانگے پالیا تجھ کو

اپنی مرضی سے فیصلہ ہو جائے
اور پل بھر میں روٹنا ہو جائے
جب بھی انسان مانگتا ہے وفا
چاہتا ہے کہ معجزہ ہو جائے



چشمِ مجنوں سے دیکھئے لیلیٰ
 جیہ مرنا ہے اس پہ مرتا ہوں
 حورِ سب شیخ کو مبارک میں
 ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں

اہلِ شاروں کے گیت شرمائیں
 اس قدر چسپت برتحمل نہ کہو
 لوگ چلمن سے لگ کے جھانکیں گے
 اتنی نکھری ہوئی غزل نہ کہو

اس نے ہر گام آزمایا ہے
 روز و شب حادثوں سے کھیلا ہوں
 والدہ کی دعا تھی میرے ساتھ
 وقت سمجھا کہ میں اکیلا ہوں

زخمِ تاریخ کے سی لیتے ہیں
 مے نہیں آشک ہی پی لیتے ہیں
 محتسبِ جامِ شکستہ موت پھینک
 ہم اٹھیں دیکھ کے جی لیتے ہیں

جو جام آیا ہے حصّے میں شغلِ جام بھی کر
 جو تشنہ لب ہیں مگر اُن کا احترام بھی کر
 ملی ہے کرسی تو شکرِ خدا پھر اس کے بعد
 ہمیں نے ووٹ دیئے ہیں ہمیں سلام بھی کر

میرا کلام اپنے کرم سے سنوارنا
 میری غزل کو خوشِ ازل سے نکھارنا
 میری دعا ہے بعدِ درود و سلام کے
 صوڑا سنا آسمانِ زمیں پر اُتارنا



مانگنے سے تو مل نہیں سکتیں
یہ ضروری ہے آپ بھی کچھ دیں
وقت خوشیوں کا ایک تاجر ہے
آپ قیمت ادا کریں لے لیں

دیکھ کر تیری مست نظروں کو
جام و ساغر چھلک گئے ہوتے
میں تو پھر رند لا ابالی ہوں
شیخ و ناصح بہک گئے ہوتے

ہر دو عالم ہیں جلوہ گاہِ جمیل
شعلہٴ حسن پھر جواں ہو گا
میری نظروں کی آزمائش ہے
یا فرشتوں کا امتحان ہو گا

رحمتِ حق کی آبیاری میں
وقتِ صبحِ نزول بیٹھا ہوں
جب بھی تیرے قریب آیا ہوں
اپنی ہستی کو بھول بیٹھا ہوں

— o —

خالق کائنات میرے سوا
سر میں موسیٰ کے بھی یہ سودا تھا
وہ حجابات کی تلاش میں تھے
اور تو سامنے ہویدا تھا

— o —

دردِ دل کی دوائہ ہو جائے
وصل سے آشنائے ہو جاؤں
اتنے نزدیک جا رہا ہوں میں
قرب سے ہی فتنائے ہو جاؤں

قومی یکجہتی

چار مینار

(انتساب بہ حیدر آباد کے دو عظیم شاعروں کے نام امین کے اسم کے گرامی ہیں
جہاندار اسرار اور اسماعیل ظریف)

چار مینار بڑا پیارا ہے، چار مینار بہت اونچا ہے
ہونا واپستہ قد، دل میں نفرت کے الاؤ لے کر
اس کو دیکھیں گے حقارت سے اگر
ٹو پیاں خاک پہ گر جائیں گی، چار مینار بہت اونچا ہے
یہ علامت ہے جناب، قومی یکجہتی کی

یہ قلی شاہ کی آفت کا پتہ دیتا ہے، مادرِ ہند کی عظمت کا پتہ دیتا ہے
گاندھی و نہرو کی رفعت کا پتہ دیتا ہے، حیدر آباد کی جنت کا پتہ دیتا ہے
چار مینار بہت اونچا ہے، چاند پرمت طہر کو

چار مینار فقط ایک عمارت ہی نہیں، ایک تہذیب، ایک تاریخ بھی ہے
اس میں شاہوں کی روایات بھی ہیں اس میں پوشیدہ طلسمات بھی ہیں

اس میں دلیوں کی کرامات بھی ہیں، اس میں انسانوں کے جذبات بھی ہیں
 اس کے مینار گراؤ گے تو دب جاؤ گے، اس کی مینا دھنڈاؤ گے تو مٹ جاؤ گے
 چار مینار بہت بچتے ہیں، یہ علامت ہے جناب قومی یکجہتی کی
 اس سے مرمت ٹکراؤ، سر جو پھوٹے گا شکایت ہوگی

چار مینار فقط بے کس دے بس ہی نہیں، چار مینار کے پاس
 کان ہیں، آنکھ ہیں اور ہاتھ بھی ہیں
 چار مینار ہے خواہیدہ ابھی، نیند سے جب یہ کبھی جاگے گا
 زلزلہ آئے گا، نفرت و ظلم سے کچلے ہوئے مجبور عوام
 فقر و ایواں سے جو پوچھیں گے حساب، انقلاب آئے گا
 حیدر آباد کی تہذیب گل آتش ہے، درت گلچیں سے کہو
 اس طرف ہاتھ بڑھائے گا تو جل جائے گا

چار مینار کا پیغام ہے کیا؟ تیشہ وقت کی ضرب
 دستِ آذر کی قسم، جس نے ڈھلے ہیں زمانے میں صنم
 سنگ مرمر کے تراشیدہ خواب، مادیت کے سراب
 اس سیہ خانے سے، ایک سورج بھی کبھی نکلے گا
 اک براہیم بھی پیدا ہوگا
 چار مینار بہت اونچلے ہیں

خوابِ فرعون

ایشیاء کے باشندے
 تو نے سراٹھانے کی گستاخی کیوں کی
 کیا تو بھوک گیا
 کہ اس غلطی کی سزا تیرے آباؤ اجداد
 کو کیا دی گئی تھی
 تو نے آسمان کی طرف کیوں دیکھا
 تو زمین کی طرف دیکھ
 تو صرف سر جھکانے کے لئے پیدا ہوا ہے
 تجھے دیکھ کر دوسرے خر بوزے بھی
 رنگ بدلیں گے
 اس لئے تجھے سزا دینی ضروری ہے
 تاکہ تیری قوم
 سبق حاصل کر سکے

اور تیری آنے والی نسلیں
 صرف ہماری سماجی، سیاسی، معاشی
 اور ذہنی غلامی کے لئے جہنم ہیں

ایشیاء کے فرزندو

پھول کا تبسم ہی
 زندگی کا پیر تو ہے
 پھول توڑنا آساں
 اک کلی کے کھلنے تک
 مہر و ماہ زمیں میں کر
 خون و دل جگر دے کر
 وقت صرف کرتے ہیں
 لاکھ کاوشیں آخر
 پھول بن کے کھلتی ہیں

مت سنو مری اپنے
 دل کی بات تو مالو
 ایشیاء کے فرزندو
 کاش تم بھی پہچانو

روشنی بڑی شے ہے
 دوستی بڑی شے ہے
 امن کی فضاؤں میں
 زندگی بڑی شے ہے

عشق کی تمنا ہے
 حسن کا ارادہ ہے
 عقل کا نتیجہ ہے
 وقت کا تقاضہ ہے

سوال

میں کھلاؤں گا شگوفے ہر روز
خوشہ چینی ہے تہا می فطرت
میں جلاؤں گا سدا فہم و فراہمت کے چراغ
تم بجھاتے رہنا
کس نے روکا ہے تمہیں

لیکن اس بات کا ہے مجھ کو یقین
آنے والی جو نئی نسل ہے، پوچھے گی ضرور
”تم نے ان ہاتھوں سے جو
دستِ گلچیں کی حمایت میں اٹھے
اور جو اعون کے بھجانے کو بڑھے
کیوں تعاون کیا، کیوں دوستی کی؟“

تَلاش

محفوظوں میں تو کامیاب ملے
 غلو توں میں بھی بارِ یاب ملے
 ہم نے ڈھالا انہیں حقیقت میں
 زندگی تجھ سے جتنے خواب ملے
 چند کلنٹے ملے تو کیا غم ہے
 زندگی بھر ہمیں گلاب ملے
 اس سے پہلے کہ ہم سوال کریں
 پتھروں سے ہمیں جواب ملے
 ہم جو ذروں کو ڈھونڈنے نکلے
 راہ در راہ آفتاب ملے
 غم سا اگر دیکارواں ہی رہا
 ہم مسرت کے ہمراہ کاب ملے
 چاندنی کی کبھی جو خواہش کی
 ہر در و بام ماہتاب ملے
 چشم ساقی کا ہے ضیا و یہ کرم
 کس کو مسرت ہے اب شراب ملے

اے مرے گاؤں

اے مرے گاؤں ترا چاہنے والا میں ہوں
دے دیا سب نے جسے دیکھیں نکالا میں ہوں

ماں نے آداب سکھائے ہیں مجھے جینے کے
دربدر ٹھوکریں کھا کر جسے پالا میں ہوں

میں وہ درد ، جو فاقوں سے اٹھا کرتا ہے
گو تہی دست سہی ، عزم ہمالہ ، میں ہوں

قوم کے جسم میں مانند کسان و مزدور
خون بن بن کے سدا دوڑنے والا میں ہوں

مثل کانٹے کے کھٹکتا ہوں دلِ گلچیں میں
بوئے گل مجھ سے ہے رختائی لالہ میں ہوں

میں غریبوں کی تمناؤں کا مرکز ہوں ضیاء
جس نے بخشا ہے اندھیروں کا ابلا میں ہوں

شکوہ یارِ طر حدار

غمید کے دن
 میرے شکوے
 پیار کی تجدید ہیں
 درد کی مہمید ہیں
 یہ شکایت ہے
 بغاوت تو نہیں
 یہ محبت ہے
 عداوت تو نہیں

نور سے بیزار ہیں
 وہ رقیبِ رو سیاہ
 ظلمتوں کے پاسباں
 روشنی سے بدگماں

بے وفا سرکش بھی ہے
روک دو

اس کی زباں
حیف کتنا لیت ہے، ان کا معیار وفا

آگیا ہے جشن کا روز سعید
خوش قدم، خوش آمدید
جی میں آتا ہے مبارک کہہ بھی دوں
ایک خدشہ ہے، رقیب کم نظر
میرے اخلاص و وفا کو
پیار کی تحب دید کو
وہ خوش آمد کہہ نہ دیں

ہے یہ تاکید خرد
ہونہ تعریف حسین
اور نہ شکوے اب بگئیں
میں غلام مصلحت
سوچتا ہوں اور کچھ دن چپ رہوں

خلاء پہ شبِ نول

زمیں سے چاند ستاروں کا فاصلہ دیکھو
 خراج مانگ رہے ہیں یہ نقشِ پا دیکھو
 جنوں ذوقِ سفر کی ہے ابتدا دیکھو
 خرد کے کربِ مسلسل کا حوصلہ دیکھو
 حقیر ہستی فانی حبابِ سانسِ انساں
 کمند پھینک رہا ہے، خلا میں جا دیکھو
 جنوں ڈھونڈ رہا ہے بہشت کی راہیں
 گناہِ حضرتِ آدم کا سلسلہ دیکھو
 خدا کا شکر ہے وہ خیریت سے آئے ہیں
 دعائیں مانگ رہی ہے کہیں وفادار دیکھو
 سرشت و جراتِ انساں پہ مسکراتا ہے
 فرارِ عرشِ معلیٰ سے پھر خدا دیکھو

جہاں پہ ہوش و جنوں کا حسین سنگم ہے
 ہم اس مقام سے گزریں گے بار بار دیکھو
 حقیر کو شش ناچیز ہی سہی لیکن
 دکھا رہے ہیں جو سورج کو ہم دیا دیکھو
 ہیں ایک شمع کی دو ٹوہڑے اہل نظر
 ضیاء جہاں ہے محبت وہاں خدا دیکھو



کچھ فرشتے ہیں اس کے ہم مشرب
 تیری رحمت سے وہ بھی جیتا ہے
 میں نے دیکھا ہے اس کا صبر جمیل
 وہ تہجد کے وقت پیتا ہے

پہچانو

عمر تیز رفتہ کے
 تیس سال تک میں نے
 ایسے ریگ زاروں میں
 روز گھاس کاٹی ہے
 جن میں کچھ نہیں اگتا
 میں بھی انقلابی ہوں —

خیر مجھ کو جانے دو
 میری سات پشتوں میں
 ایک بھی نہ تھا ایسا
 انقلاب کے پہچنے
 ٹھیک سے جو کھیلتا
 پھر بھی میرا دعویٰ ہے

میں بھی انقلابی ہوں —

باپ ماں عزیزوں کی
 نہ کبھی ہی عزت کی
 نہ کبھی ہی خدمت کی
 ملک و قوم و ملت کی
 گیت روز گائے ہیں
 میں نے کھوکھلے مغرے
 ہر جگہ لگائے ہیں

میں بھی انقلابی ہوں —

ایک ایسی سیڑھی ہوں
 جس پہ پیر رکھ رکھ کر
 کتنے پستہ قد بونے
 کر سیوں پہ جا پہنچے
 میں غریب کی بیوی
 ہر کسی کی بھائی ہوں

میں بھی انقلابی ہوں —

احساسِ کمتری

آؤ!

ہم! سے صلیب پر چڑھائیں
کیوں؟ اُس نے کیا غلطی کی ہے

وہ ہمارا رہنما تھا

اُس نے غلط فیصلے کئے

جن کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا

ہم نے سوچا تھا وہ مسیحا ہے

جو مردہ قوم میں روح پھونک دے گا

عصرِ حاضر کے فراغین کی غلامی سے نکلے گا

ہمیں آسمانوں تک جانے کا راستہ بتائے گا

جہاں خوشحالی ہے خوشی ہے اور سر بلندی ہے

اچھے ہمارے دوسرے قبیلوں سے

جس عزمِ حوصلے اور عملی مدد کی توقع تھی

وہ پوری نہ ہو سکی

جبرأت اور ہمت کی جگہ مصلحت نے لے لی
 کھوکھلے نعرے اور جلوس اُس کے کسی
 کا اٹہ آسکے

کسی نے اُس کی پشت میں چہرہ گھونپ دیا
 پھر بھی اُس نے یل صراط پر چلنے کی کوشش کی
 مگر کٹ گیا

آؤ! ہم اُس کی پشت پر ہیں ایک اور خجراتاں میں

ہماری نجات کی راہ یہی ہے
 کہ ہم اُسے صلیب پر چڑھا دیں
 تاکہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا ہو سکے
 شہید ضرور آسمان پر رہتے ہیں مگر
 اُن کی قبریں زمین ہی پر بن سکتی ہیں

میں نے کیا کیا

عیری رگوں میں جو ہے خون وہ نہیں ضائع
میں بھول بیٹھا ہوں کیا چیز ہے حلال و حرام
یہی سبب ہے کہ ہے بزدلی شعار میرا
نہ میرے دل میں ہے جرأت نہ ہے نظر بے باک
میرا شعار غلامانِ مصلحت میں ہے

اور اس پہ میرا یہ شکوہ کہ وقت کی آنکھیں
مجھے حقارت و نفرت سے دیکھا کرتی ہیں
اب آپ فیصلہ کیجئے کہ کیا مناسب ہے؟

التمت بالخير

تو ایک عام سی لڑکی ہے کوئی حور نہیں
 کہ تیرا ذکر کتابوں میں بار بار آئے
 ورق ورق تری پاکیزگی کے چرچے ہوں
 جو شیخ نام سین دل کو کچھ ترسار آئے

میں ایک راہ کا پتھر ہوں، کوہِ نور نہیں
 حسین ملکہِ زرین کے سر کا تاج بنوں
 وفا کے نام کا مطلب یہی سمجھنا ہوں
 کہ تیرا پیٹ جو بھر جائے اپنا پیٹ بھروں

نہ ہو گی مجھ سے محبت تجھ نہ ہو سکتا
 مرا یقین ہے تیرا جواب ہے اثبات
 اگرچہ حسن پہ تیرے میں مر نہیں سکتا
 مرا سوال ہے بن جا مری شریکِ حیات

This book is dedicated to:

1. *Rev. Moulana Jalaluddin Roomi.*
2. *Dag Hammarskjöld.*
3. *Dr. Iqbal.*
4. *U Thant.*
5. *Rabindranath Tagore*
6. *Rev. Mother Teresa.*
- and*
7. *Jimmy Carter*

Zia Jabalpur
 OLD BUS STAND, KAMAREDDY,
 INDIA - 503 111.